ڈاکٹر بلال سہیل
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو
فیڈرل گورنمنٹ سرسیّد کالج روالپنڈی

''اُمراؤ جان آدا'' کی تکنیکی، تہذیبی اور فکری جہات

In this research paper, the technical, cultural and intellectual aspects of "Umrao Jan Ada" have been discussed. The narrative technique of Mirza Hadi Ruswa's innovative, bold and trendsetting novel, written in the nineteenth century, is analyzed to know how a sick society has impacted on its individuals. It is also clarified that the way the novelist portrayed a whore to depict the nineteenth century Lucknow is not a Feminist quest, and not a lapse in craft. Though this masterpiece is being critically studied for the last one hundred and sixteen years in different ways, but in this paper, for the very first time, the symbolic and ironic representation is evaluated as a narrative of supposed and true realities. It attempts to assess the way the novelist frequently satirizes the unreal concepts of his society, human flexibilities in certain conditions and cultural dimensions to denote its literary contribution to Urdu fiction.

مرزا محمّد ہادی رُسوا کے اُنیسویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں جو ناول سامنے آئے، اُن میں ''اختری بیگم''، ''ذات شریف''، ''خونی شہزادہ''، ''شریف زادہ'' اور نامکمل ناول'' افشائے راز'' اُردو ناقدین کو ہیئتی یا فکری حوالے سے زیادہ متاثر نہیں کر سکے۔ یہ ہی حال اُن کے تراجم کا بھی رہا ہے، جس کی ایک بڑی وجہ شاید ادبی سرگرمیوں کا مرزا صاحب کی ذاتی زندگی میں کم اہم ہونا ہے۔ اُنیسویں صدی کے معمولی درجے کا انگریز کہانی کار جورج رینالڈز جو اپنے عظیم ہم عصر چارلس ڈکنز اور ولیم تھیکری سے زیادہ مقبول تھا، محکوم ہند میں بھی بے حد پسند کیا جاتا تھا، ڈاکٹر نیّر مسعود کی اطلاع کے مطابق لکھنؤ شہر سے اُس کے ناولوں کے پانچ مختلف ترجم چھپے، جن میں سے تین ترجمے مرزا محمّد ہادی رُسوا کی یادگار ہیں۔ رینالڈز کا مشہور ناول ''روز الیمبر ٹ'' مطبوعہ ۱۸۵۴ء بھی ایک بچھڑی ہوئی خاتون کی کہانی ہے، جس کی امراؤ جان کی زندگی سے کچھ مماثلت ضرور ہے، مگر اُس ناول کی پیش کش ''امراؤ جان ادا'' ایسے کثیر جہتی فن پارے کے مقابلے میں بالکل معمولی ہے۔ مرزا صاحب نے حقیقی انسانی تجربات کے ادراک کے لیے اِس فن پارے کو ایک معیاری تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے، جو اپنی اوّلین اشاعت ۱۸۹۹ء سے طرح طرح کے تہذیبی، فکری، تکنیکی اور صنفی مباحث کا باعث بنا ہوا ہے۔ اِس ناول کی تخلیق میں مرزا صاحب نے اپنی صلاحیتوں کا جم کر اظہار کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ''اُمراؤ جان آدا'' اُردو کا پہلا ''حقیقی ناول'' قرار دیا جاتا ہے۔[1]

اِس ناول کو جو بات اِس سے پہلے سامنے آنے والے ناولوں سے مختلف بناتی ہے، وہ کہانی بیان کرنے کی تکنیک ہے۔ جس

پر اِس ناول کے ابتدائی ناقدین پوری توجہ نہیں دے پائے۔امینہ یقین نے اپنے وقیع مقالے میں اِس کی عمدہ نشان دہی کی ہے۔[۲] مردنژاد معاشرے جس طرح حقیقی زندگی میں عورت کو اُس کے حقوق نہیں دیتے، تانیثی زاویہء نظر سے دیکھنے والوں کے خیال میں ادب میں بھی اُسی طرح عورتوں کا استحصال کرتے ہیں۔فرانسیسی ناول نگار جولیا کرستیوا تو عورت کے وجود کو ادب میں بطور ایک موضوع کے ناقابلِ بیاں قرار دیتی ہیں۔ جولیا کرستیوا کے نزدیک عورت سے مراد ہے ،جس کی عکاسی نہ ہو سکے، جو تکنیکی اصطلاحوں اور نظریوں سے بلند ہو۔جواں مرگ امریکی ناول نگار سلویا پلیتھ تو اپنے ناول ''بیل جار'' میں اِس طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں تک کہہ گئی ہیں کہ ہمارے متعلق بات کی جاتی ہے،ہم سے بات کی جاتی ہے،ہم پر بات کی جاتی ہے ،مگر ہماری خاطر کبھی بات نہیں کی جاتی۔اِس پس منظر میں رُسوا کا اُنیسویں صدی میں ایک عورت کو،وہ بھی جو ایک طوائف ہو، ناول کا مرکزی کردار بنانا، ناول کا بیان کار بنانا،ناول کو اُس سے موسوم کرنااور متن میں اپنے ایک ہم زاد کوشامل کرنا قابلِ لحاظ ادبی اِجتہاد ہے، جسے سمجھنے کے لیے یہ مثال بہت مناسب ہے کہ اکیسویں صدی کے میں امریکا میں(۲۰۱۴ء)''شیکسپیئر کی بیسوائیں''جنسیات؛سیاسیات اور شعریات کے عنوان سے عظیم فن کار کا مبسوط مطالعہ کرتے ہوئے مصنفہ کو یہ لکھنا پڑتا ہے :

''مَیں ایک بیسوا نہیں ہوں۔یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہونی چاہیے،ویسا ہوتے ہوئے ،میرے قارئین میں سے بہت سے(جیسا کہ خیال کرتے ہیں)،مَیں روٹی کماتی ہوں یونی ورسٹی کی ایک پروفیسر کے طور پر،مطالعاتِ شیکسپیئر میں تخصّص کے ساتھ ، نہ کہ ایک جنسی پیشہ ور کی حیثیت سے۔تاہم وہ حقیقت نہیں روک پائی ،بہت سے لوگوں کو مجھے بیسوا کہنے سے میری زندگی میں مختلف مواقع پر۔'' [۳]

اگرچہ''امراؤ جان ادا'' کا متن سلویا پلیتھ کی تائید کررہا ہے،امراؤ کا زاویہء نگاہ تانیثی نہیں، تذکیری ہے،امراؤ جس طرح آبادی بیگم کا ذکر کرتی ہے،وہ اُسلوبیاتی حوالے سے کتنا ہی قابلِ قدر سہی ،فکری حوالے سے اُسے تذکیریت کی ترجمانی خیال کیا جائے گا۔کے۔کے۔کھلر نے لکھا ہے :

''اِس ناول میں نقطہء نظر تماش بین مرد کا نہیں(ناول 'نشتر' کی طرح)بل کہ پیشہ ور طوائف کا ہے۔'' [۴]

ایک طوائف کا نقطہء نظر،ایک عورت کا نقطہء نظر ضرور ہے ،مگر اُس نقطہء نظر کو تانیثی فکر تسلیم نہیں کیا سکتا ،کیوں کہ وہ آزاد وجود سے محروم ،مردوں کی آلہء کار ہوتی ہے ۔قاضی افضال حسین کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ایک نسائی تشخص کے باوجود اِس ناول کا راوی اُنھیں اقدار کا حامل ہے،جواصلاً مرداَساس ہیں۔ قاضی افضال حسین امراؤ کے نام بدلے جانے کو بھی تذکیری حربہ سمجھتے ہیں:

''غور کیجیے! امیرن جب اغوا کی گئی،گویا اُس کا مادی وجود خود اُس کے اختیار سے نکل گیا۔وہ کسی بھی دوسرے مالِ تجارت کی طرح بیچی اورخریدی جاسکتی ہے اور جب خانم اُس کا نام بدل کرامراؤ جان رکھتی ہے،تو گویا ایک نچلے متوسط طبقے کی لڑکی کو اُس کی فطری/حقیقی جذباتی اور ذہنی کائنات سے محروم کر دیا گیا۔یہ صرف ایک نام کی تبدیلی ہی نہیں،بل کہ ایک وجود پر بعض مخصوص ترجیحات کے حوالے سے قبضہ (Appropriation) ہے۔'' [۵]

امینہ یقین کے تئیں امراؤ کا کردار ایک پیچیدہ کردار ہے،جس کی کہانی رُسوا اور خود اُس کے کردار کے مکالماتی عمل کے ذریعے بیان ہوتی ہے۔ناول نگار کا شخصی ضمیر کا استعمال قاری کو یہ ناول ایک خودنوشت سوانح عمری کے طور پر پڑھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے''شخصِ متکلم'' بیانیہ آوازوں کی تقدیم و تاخیر سے رُسوا اور امراؤ کی صورت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔اُردو ناول کی حد تک یہ ایک انوکھی اور کارگر تکنیک تھی،جس نے مرزا صاحب کے ناول کو وقار بخشا۔

ایم۔اسد الدین زیرک قاری سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ رُسوا بطور شخص اور رُسوا بطور بیان کے فرق کو ملحوظ رکھے ۔کیوں کہ وہ مختلف اوقات میں مختلف رُوپ اپنا کر سامنے آتا ہے۔علیسن سفادی نے اِس حوالے سے''امراؤ جان ادا'' کے لیے میخائل باختن کی وضع کردہ''پولی فونک ناول'' کی معنی خیز اصطلاح برتی ہے۔ اِس ناول کے تہذیبی اور فکری مطالعے سے قاری جن متنوع نتائج پر پہنچتا ہے، اُن میں سے ایک تو یہ ہے کہ امراؤ یادوں کے آئینے میں خود کو اِس طرح تلاش کرتی ہے کہ گویا خود کو کہانی سنا رہی ہے،مگر وہ اپنی ذات کو سمجھنے سے معذور رہتی ہے۔خود شناسی کے لیے درکار اُمید پرستی اُس میں نظر نہیں آتی۔جس کی وجہ اُس کی ذات کا خلا ہے۔ تاہم امراؤ کی وجودی کم زوریاں ناول کی ساخت اور معیار کو متاثر نہیں کرتیں۔ناول سے منسوب تمام روایتی شرائط پر پورا اُترنے اور بعد میں آنے ناولوں کو بہت زیادہ متاثر کرنے والے اِس ناول کے ذریعے اُردو ناول کی تاریخ میں پہلی بار تہذیبی طرزِ احساس اور گھمبیر سوالات کا ایک متوازن تال میل سامنا آیا ہے۔

''امراؤ جان ادا'' کی تہذیبی اور فکری جہات پر بات کرتے ہوئے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ انسانی فطرت اور سماج کے تقاضے ایک دوسرے سے متصادم ہوسکتے ہیں، اِس لیے زمینی یا زمانی اعتبار سے دُور بیٹھے ہوئے آدمی کی نظر میں کوئی بھی سماج اپنی کلی حیثیت میں بیمار ہوسکتا ہے۔سگمنڈ فرائیڈ سمیت بعض ماہرینِ نفسیات نے انسانی فطرت کے مطالعے میں اِس سوال کو خاصی اہمیت دی ہے، کیوں کہ اُن کے تئیں یہ سوال تمام انسانی نسلوں، تہذیبوں اور زمانوں میں مشترک ہے۔فرائیڈ نے اُن ضروریات اور محرّکات کو نظرانداز نہیں کیا،جو انسانی فطرت پنہاں ہیں۔فرائیڈ خیال ہے کہ تہذیب ،انسان کی ضروریات کے ساتھ بڑھتے ہوئے تصادم میں نشوونما پاتی ہے۔جب تک ایک سماج اپنے فرائض قابلِ قبول مسلمات اور روایات کی شکل میں ادا کر رہا ہوتا ہے،تو وہ صحت مند معاشرہ کہلاتا ہے۔جس وقت افراد معاشرے کے اسالیبِ زیست سے خود کو ہم آہنگ نہیں پاتے ،اُس وقت معاشرے کی صحت پر ایک سوالیہ نشان لگایا جا سکتا ہے۔جدید سماجی ماہرین کے خیال میں معاشرے کو ذہنی طور پر صحت مند اُس وقت کہا جائے گا،جب وہاں انسانوں کے لیے انسانی فطرت کے اوصاف اور قوانین کی روشنی میں نشوونما کے کمال تک پہنچنے کے امکانات واضح طور پر موجود ہوں ۔ ذہنی صحت کسی موجود معاشرتی نظام سے انفرادی ہم آہنگی کا نام ہے ،جو ایک آفاقی حقیقت اور انسانی وجود کے مسئلے کا قابلِ قبول حل بن جاتی ہے۔کسی معاشرے کو ذہنی صحت سے محروم قرار دے دینا اختلافی اور خطرناک امر ہے،مگر''امراؤ جان ادا'' کی کہانی اور متن مُصر ہیں کہ لکھنوی معاشرے کو ایک بیمار معاشرے کے طور پر بھی دیکھا جائے۔یہ زاویہء نظر اِس ناول کو ایک'' کولونیئل ناول'' کے طور پر دیکھنے پر اصرار کرے گا۔جس کی رُو سے یہ کہنا مشکل اور غلط نہیں ہوگا کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے لکھنؤ کو ''امراؤ جان ادا'' کے ایک کردار اور تخلیق کار کے طور پر مرزا رسوا بھی ایک بیمار معاشرے کے طور پر دیکھ رہے تھے ،کیوں کہ

وہ معاشرہ ایسی روایات اورترجیحات پیش کرنے سے قاصر تھا، جو افراد کی ذہنی اور جذباتی کارگزاری کا تعین اور انسانی وجود کے مسئلے کا مناسب حل ڈھونڈنے کی کاوش کرتی ہیں۔ سماجی نظام انسان کے بنیادی جذبوں کو تخلیق نہیں کرتا ، انسان کے اہم جذبے اور تحریکیں انسان کے مجموعی وجود سے جنم لیتے ہیں اور اُن کا تعین اور شناخت بھی ممکن ہے۔ جوانسان کے لیے خوشی یا غم کا باعث بنتے ہیں۔ انسانی جذبوں کے حوالے سے سماجی نظام کا اتنا عمل دخل ضرور ہے کہ وہ اِس بات کا تعیّن کرتا ہے کہ امکانی جذبوں میں سے کون سا جذبہ ظاہر یا نمایاں ہونا چاہیے۔کسی بھی تہذیب میں انسان کی نمایاں سرگرمی محض انسانی فطرت کا مظہر نہیں ہوتی،بل کہ یقینی طور پر ایک مخصوص صورت میں اُس مظہر کا تعین انسان کے سماجی حالات سے ہوتا ہے، جن میں وہ زندگی بسر کررہا ہوتا ہے۔

''امراؤ جان ادا''میں پیش کردہ خیالات یا احساسات کولکھنوی معاشرے کے ارکان کی اکثریت قبول ضرور کیے ہوئے تھی،مگر تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیالات یا احساسات تخلیق کار کی نظر میں اِس قدر غیر حقیقی تھے کہ انھیں ایک بیمار تہذیب کی ترجمانی کیے بغیر چارہ نہیں۔ ہزاروں لاکھوں افراد کسی غیر حقیقی تصوّر یا احساس میں مبتلا ہونے سے حقیقی نہیں ہو جاتے۔جیسے ڈھیر سارے لوگوں کی غلطیاں مل کر بھی درست عمل نہیں کہلاسکتیں۔ لاکھوں کروڑوں انسان اگر ذہنی عارضوں کی ایک جیسی صورتوں کا شکار ہوں، تو ایک المیہ کہلاسکتا ہے،مگر یہ واقعہ اُن لوگوں کو ذہنی طور پر صحت مند قرار نہیں دے گا۔''امراؤ جان ادا''میں لکھنوی معاشرہ نہ صرف انفرادی سطح پر آزادی ،بے ساختگی اور اپنی ذات کے بھرپور اظہار میں ناکام نظر آتا ہے،بل کہ اجتماعی سطح پر بھی معاشرے کے ارکان کی اکثریت ایسے کسی نصب العین کے حصول میں کوشاں نہیں رہی۔دلاور خان، خانم، حسینی،بسم اللہ،مولوی اور نواب ہرفرد ایک سے نقائص میں مبتلا ہے اور اُنھیں یہ شعور نہیں کہ اُن میں کوئی نقص ہے یا اُن کے حقیقی وجود کو کوئی خطرہ درپیش ہے یا وہ حقیقی مسرّت اور ہنرمندی سے محروم ہیں،صورتِ احوال کے گھمبیر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ گناہ، تشویش اور زوال کا احساس اِتنا پھیکا پڑ چکا تھا کہ بیمار لکھنوی تہذیب میں نقائص کو خصائص کا درجہ مل چکا تھا۔

انسانی رویّوں کے تعیّن میں حقیقت اور حقیقی چیزیں اتنا بڑا کردار ادا نہیں کرتیں جتنا کہ وہ چیزیں جنھیں انسان حقیقی چیزیں اور حقیقت خیال کرتا ہے۔ انسان کی زندگی کا دارو مدار اُس تصوّر پر ہوتا ہے، جسے وہ حقیقت سمجھتا ہے۔ انسان یا اُس کے سماج کی حقیقت ہی غیر حقیقی ہو تو اُس کے نتائج کے بھیانک پن کا اندازہ لگانے کے لیے''امراؤ جان ادا''اپنے تہذیبی اور فکری تناظر میں ایک مستند دست آویز کا کام دے گا۔درجِ ذیل مثالوں سے اِس دعوے کی وضاحت ہو جائے گی۔ پہلا اقتباس اُس موقع کا ہے جب خانم جان اور حسینی نامی طوائفیں امراؤ کو اغوا کر کے لانے والے دلاور خان سے اُسے خرید رہی ہیں:

> ''خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے مُوئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا بھی خوفِ خدا نہیں۔بُوا حسینی! ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں،عذاب ثواب اِنھی مُوؤں کی گردن پر ہوتا ہے۔ ہم سے کیا، آخر یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی۔حسینی: خانم صاحب! یہاں پھر اچھی رہے گی۔ آپ نے سُنا نہیں ! بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں ؟ خانم: سنا کیوں نہیں ۔ اَے اَبھی اُس دن کا ذکر ہے، سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔سینخوں سے داغ کے

مار ڈالا۔ حسینی: دُنیا میں جو چاہیں کر لیں، قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہوگا۔ خانم جان: منہ کالا ہوگا! جہنم کے کندے پڑیں گے۔ یہ ہی سزا ہے۔''[۶]

جب طوائف کو نائکہ یا خوداُس کے گھر والے پہلی بار جنسی کارروائی کے لیے معاوضے کے عوض کسی تماش بین کے سپرد کرتے تھے،تو یہ یادگار موقع 'مسی کی رسم' کہلاتا تھا۔باقی تفصیل رُسوؔا کے الفاظ میں :

''بسم اللہ کی مسی بڑھ دھوم سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے شاہی سے لے کر اب تک پھر ویسی مسی نہیں ہوئی۔ دل آرام کی بارہ دری اِس جلسے کے لیے سجائی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں' ڈوم' ڈھاڑی' کشمیری بھانڈ سب ہی تو تھے۔ دُور دُور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گویّے دلی سے آئے تھے۔ سات دن رات گانے بجائے کی صحبت رہی۔ خانم نے جیسا دل کھول کے حصّے تقسیم کیے ہیں۔ اُس کا آج تک شہرہ ہے۔ بسم اللہ، خانم کی اکلوتی لڑکی تھی، جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ نواب چھبن صاحب نے اپنی دادی نواب عمدۃ الخاقان بیگم کا ورثہ پایا تھا۔ بہت ہی کم سن نواب زادہ تھا۔ خانم نے خدا جانے کن ترکیبوں سے کمپامارا۔ بے چارہ پھنس ہی تو گیا۔ پچیس تیس ہزار روپے نواب صاحب کے اُس جلسے میں خرچ ہوئے۔ اس کے بعد بسم اللہ نواب صاحب کی ملازم ہوئیں۔ دم ہوش چاہتے تھے۔''[۷]

ناول میں پیش کردہ لکھنوی تہذیب کی یہ جہت کسی بھی غیر جانب دار قاری کو یہ کہنے پر مجبور پائے گی کہ اُس میں اِس قدر چھچھورپن اور بے معنویت سرایت کر چکے تھے کہ اِس کا اہلِ لکھنؤ کو احساس تک نہیں تھا،وہ تو افغانی شاعر بابؔر کے مشہور مصرعے''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کی عملی تفسیر بنے ہوئے تھے۔اِس المیے کو رسوا نے کیسے غیر جانب دارانہ انداز میں ایک پائے دار تخلیقی تجربے اور تہذیبی مطالعے میں ڈھالا ہے، یہ جاننے کے لیے درجِ ذیل اقتباس بہت کفایت کرے گا:

''جب سے بسم اللہ کی مسی ہوئی، خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے، میرے دل میں ایک خاص قسم کی اُمنگ پیدا ہوئی۔مَیں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم (جس سے بالکل نا واقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہوگئیں۔ بے باکی کی سند حاصل ہوگئی، آزادی کا خلعت مل گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے علیحدہ ہوگئے۔مَیں ان کی نگاہوں میں حقیر سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ اُن کے کمرے جُدا جُدا سجا دیے گئے تھے۔ نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے، فرش پر ستھری چاندنی کھچی ہوئی، بڑے نقشی پان دان، حسن دان، خاص دان، اُگال دان، اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے ۔ دیواروں پر حلبی آئینے، عمدہ عمدہ تصویریں ،چھت میں چھت کیریاں لگی ہوئی، جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ اِدھر اُدھر عمدہ ہانڈیاں۔ سرِشام سے دو کنول روشن ہو جاتے ہیں۔ دو دو مہریاں، دو دو خدمت گار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ خوب صورت نو جوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر۔ چاندی کی گڑگڑی منہ سے لگی ہوئی ہے، سامنے پان دان کھلا ہوا ہے۔ ایک ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں ۔چُہلیں ہوتی جاتی ہیں۔ اُٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں،

چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے جاتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پروا ہی نہیں کرتیں جو ہے اِنھی کے حکم کا تابع ہے۔ حکومت بھی وہ کہ زمین و آسمان ٹل جائے، مگر اِن کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمایشوں کو تو ذکر ہی کیا، بن مانگے لوگ کلیجا نکال نکال کے دیے جاتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے، کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی قبول نہیں ہوتی، کوئی بات نظر میں نہیں سماتی۔ بے پروائی یہ کہ کوئی جان بھی دے دے تو اُن کے نزدیک کوئی مال نہیں۔ غرور ایسا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت اِن کی ٹھوکر پر ہے۔ ناز وہ جو کسی سے اُٹھایا نہ جائے، مگر اُٹھانے والے اُٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے، مگر مرنے والے مر ہی جاتے ہیں۔ اِدھر اِس کو رُلا دیا، اُدھر اُسے ہنسا دیا۔ کسی کے کلیجے میں چٹکی لے لی، کسی کا دل تلووں مسل ڈالا۔ بات بات میں روٹھی جاتی ہیں، لوگ منا رہے ہیں۔ کوئی ہاتھ جوڑ رہا ہے۔ کوئی منت کر رہا ہے۔ قول کیا اور مکر گئیں، قسم کھائی اور بھول گئیں۔ محفل بھر میں سب کی نگاہیں اُن کی طرف ہیں، یہ آنکھ اُٹھا کے بھی نہیں دیکھیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا، ادھر ہی سب دیکھنے لگے۔ جس پر اِن کی نگاہ پڑتی ہے اُس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں اور یہ جان جان کے جلا رہی ہیں اور لطف یہ کہ دل میں کچھ بھی نہیں۔ وہ بھی ہیچ ہے، یہ بھی ہیچ ہے، فقط بناوٹ اگر وہ بے چارہ اِس فریب میں آ گیا۔ پھر کیا تھا۔ پہلے بظاہر خود مرنے لگیں۔''[۸]

کتھن میں بیان کردہ انحطاط پذیر لکھنوی تہذیب کا یہ واقعیت پسند رُخ مغلیہ دارالحکومت دہلی کے محمّد شاہ رنگیلے کے دور کی یاد دلا رہا ہے، جب ''او بیگم'' نامی خاتون ننگے بدن پر کمال مہارت سے بیل بوٹے بنوا کر شاہی دربار میں شرکت کرتی تھی اور خواص کے علاوہ کسی پتہ نہیں چلتا تھا کہ موصوفہ محض مسکراہٹ اوڑھے ہوئے ہیں۔

''اُسی زمانے میں نواب جعفر علی صاحب کی ملازم ہوئی۔ سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا۔ منہ میں ایک دانت نہ تھا، پشت خم ہوگئی تھی۔ سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا، مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے۔ ہائے وہ اُن کی کیچلی کا انگرکھا اور گل بدن کا پاجامہ، لال نیفہ، مصالح دار ٹوپی، کاکلیں بٹی ہوئی، عمر بھر نہ بھولیں گی۔ آپ کہیے گا کہ اِس عمر اور ایسی حالت میں رنڈی نوکر رکھنا کیا ضرور تھا۔ سنیے مرزا صاحب! اُس زمانے کا فیشن یہی تھا کوئی امیر رئیس ایسا بھی ہوگا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔ نواب صاحب کی سرکار میں جہاں اور سامان شان و شوکت کے تھے، وہاں سلامتی منانے کے لیے جلوسیوں میں ایک رنڈی کا بھی اسم تھا پچھتر روپے ماہ وار ملتے تھے۔۔۔۔ اور تکلف سنیے، نواب بوڑھے ہوگئے تھے، مگر کیا مجال نو بجے کے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں۔ اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہوگئی، کھلائی آ کے زبردستی اُٹھا لے جاتی تھی۔ نواب صاحب کی والدہ زندہ تھیں، اُن سے اُسی طرح ڈرتے تھے جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہو۔ بیوی سے بھی انتہا کی محبت تھی۔ بچپن میں شادی ہوئی تھی، مگر سوائے عشرہ ءمحرم اور شبوں کے کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ آپ تو ہنستے ہوں گے مگر میرے دل سے پوچھیے۔ بے شک پیار کرنے کے قابل تھے۔ اِس بڑھاپے میں جس وقت سوز پڑھتے تھے دل لوٹ جاتا تھا۔ فنِ موسیقی میں اُن کو کمال تھا۔ کیا مجال ان کے سامنے کوئی گا سکے۔ اچھے اچھے گویوں کو ٹوک دیا۔ سوز خوانی میں یکتا تھے۔''[۹]

بیمار معاشرے میں ہر شعبہ ء حیات غیر حقیقی، تکلیف دہ اور مضحکہ خیز صورت اختیار کر جاتا ہے، چاہے اُس کا تعلق مذہب سے ہو یا تعلیم سے، حکومت سے ہو یا عدالت سے۔ بسم اللہ کے سچے عاشقوں میں ایک مولوی صاحب قبلہ کا چہرہ بھی تھا۔ ایسے ویسے مولوی نہ تھے۔ عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دُور دُور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔ معقولات میں اُن کا مثل ونظیر نہ تھا۔ سن شریف ستر سے کچھ ہی کم ہوگا۔ نورانی، چہرہ سفید داڑھی، سر منڈا ہوا، اِس پر عمامہ، عبائے شریف، عصائے مبارک۔ اُن کی صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ ایک چھٹی ہوئی شوخ نو جوان رنڈی پر عاشق ہیں۔ بسم اللہ حکم دیتی ہے پرانے نیم کے درخت پر چڑھ جاؤ۔ مولوی صاحب پائنچے چڑھا کے درخت پر چڑھنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اِس دیکھنے کا مطلب تھا کہ بس یا اور؟ بسم اللہ اور چڑھنے حکم دیتی ہے اور وہ درخت کی پھننگ کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ آگے شاخیں اس قدر پتلی تھیں کہ وہ لازمی طور پر گر پڑتے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ۔ بسم اللہ کی زبان سے لفظ'' اور'' نکلنے ہی کو تھا کہ امراؤ اور میر صاحب نہایت منت سماجت سے اُن کی جان چھڑاتے ہیں۔ رُسوا کا اِس مضحکہ خیز مگر فکر انگیز واقعے پر تبصرہ طنز اور جامعیت کا ایک انوکھا اور امر نمونہ ہے:

> ''یہ واقعہ عمر بھر ہنسنے کے لیے کافی ہے۔ تصوّر شرط ہے۔ تم نے تو بیان کیا اور میری آنکھوں کے سامنے بسم اللہ ،مولوی صاحب اور اُن کی مقدّس صورت، میر صاحب، تم، صحن، نیم کا درخت، اُن سب کی تصویر کھینچ گئی۔ یہ تو کچھ ایسا واقعہ ہے کہ دفعتاً ہنسی بھی نہیں آتی۔ مولوی صاحب کی حماقت پر رونا آتا ہے۔ بے شک ،بسم اللہ قیامت کی رنڈی تھی۔ ستر برس کا بڈھا اور اُس پر یہ حکم درخت پر چڑھ جاؤ اور وہ بھی چڑھ گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑا دقیق مسئلہ ہے۔''[۱۰]

''بڑا دقیق مسئلہ ہے'' ذکاوت اور استہزا کا وہ حیران کُن مقام ہے ،جو اوسکر وائیلڈ کے سماجی ڈرامے "The Importance of Being Earnest" ایسے فن پاروں میں نظر آتا ہے۔ اُمراؤ جب بسم اللہ سے کہتی ہے کہ ستر برس کا بڈھا ،جو درخت پر سے گر پڑتا تو مفت میں خون ہوجاتا ،بسم اللہ کی طرف سے اِس موقع پر دیا جانے والا جواب سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے:

> ''ہماری بلا سے خون ہوتا۔ مَیں تو اُس موئے بوبک سے جلی ہوئی تھی۔ کل میری دھنو (پالتو بندریا) کو اِس زور سے پٹخا کہ ہڈی پسلی ٹوٹ گئی ہوتی۔''[۱۱]

یہاں بسم اللہ کے مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ نام نہاد نیک نام انگریزی عدالتی نظام کو بے نقاب کرنے والے اُن دو مولوی صاحبان کا ذکر بہت ضروری ہے، جو نواب محمود علی خاں کے اِس جھوٹے دعوے کی کہ امراؤ اُس کی منکوحہ ہے، گواہی کے لیے عدالت میں پیش ہوتے ہیں:

> ''نکاح کے ثبوت میں دو مولوی پیش کیے گئے تھے۔ جن کے ماتھوں پر گٹے پڑے ہوئے، بڑے بڑے عمامے سر پر، عبائیں زیبِ دوش، ہاتھ میں کنٹھے، پاؤں میں کفشیں، بات بات میں قال اللہ قال الرسول، اُن کی صورت دیکھ کے حاکمِ عدالت کیا، کسی نیک نیت آدمی کو کذب و دروغ کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔''[۱۲]

''امراؤ جان ادا'' کے غائر مطالعے سے قاری اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ غیر حقیقی لوگ اپنی انا کو زندگی کا مرکز بنانے

کے سبب زمینی حقائق سے کٹ کر اپنے آپ میں گم ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں بھری دنیا میں صرف اپنے تئیں دل چسپی ہوتی ہے، باہر کی دنیا سے نہیں ۔ وہ تو حسن سے بھی محبت نہیں کرتے محض اُسے حاصل کرنا چاہتے ہیں ، وہ بھی اپنے لیے،اپنی انا کی تسکین کے لیے۔ اُن کے خیالات، جذبات اوراعمال کا مرکز اُن کی ذات ہوتی ہے۔جس کے گرد دنیا گھومتی ہے۔ وہ کسی ایسی شے کا سوچ بھی نہیں سکتے ،جو اُن کی ذات سے بے گانہ ہو۔وہ باہر کی دنیا سے فقط اتنا سا رشتہ رکھتے ہیں کہ وہ اُن کے جذبات اُکساتی رہے، اُن کے ساتھ اچھے ڈھب سے پیش آئے۔ اُن کی لطف اندوزی اور ذاتی تسکین اور تعظیم کا سامان بنے۔ وہ بندریا جس کے ٹھاٹھ سن کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ اطلس کی گھگھریا، کام دانی کی کرتی، جالی کی اوڑھنی، چاندی کی چوڑیاں، طوق ، گھنگرو، سونے کی بالیاں، کھانے کو جلیبیاں اورامرتیاں دست یاب تھیں۔ اُس کو پٹخنے پر مولوی صاحب کو کھٹکے کا لنگور بنا دیا۔رُسوا یہ کھٹکے کا لنگور اوربسم اللہ کی بندر یا بے سوچے سمجھے نہیں لائے،بندریا کے ذریعے مولوی صاحبان کو جو مذہب کی علامت ہیں،جنھیں تقدّس اور اعتبار حاصل ہوتا ہے، اُسے ڈی ہیومینائز کرنے ، مقدس اورمعتبر آدمی کو تجریدی بنانے کے لیے، یہاں بندریا کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔اِس صورتِ حال پرعہدِ حاضر کے ممتاز ناول نگار اور افسانہ نگارانتظار حسین کا افسانہ'' 'آخری آدمی'' توضروریاد آتا ہے۔ غیر حقیقی شے کسے کہتے ہیں؟ وہ شے جو ہمیشہ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے اُسے وہ ہونے کا دعویٰ ہے ،جو وہ نہیں ہے اور اِسی باعث اُسے وہ حقیقت خیال کیا جاتا ہے ،جو وہ نہیں ہوتی ۔ یہ ہی غیرِ حقیقت،رُسوالکھنوی تہذیب کے ایک بنیادی تعارف کے طور پر''امراؤ جان ادا'' کی فن کارانہ تشکیل میں مدّ نظر رکھتے ہیں،جس کی وجہ سے یہ ناول ایک طوائف کی کہانی بننے کی بجائے ایک بہت بڑا تہذیبی سوال بن جاتا ہے۔انسان کوزندگی کے بارے میں ،بل کہ خود اپنے بارے بے شمار ایسی چیزوں سے پالا پڑتا ہے، جو بظاہر اِس طرح معلوم ہوتی ہیں، جس طرح وہ حقیقتاً نہیں ہوتیں۔ کسی چیز کے حقیقی ہونے سے مراداُس کا اہم،قابلِ توجہ یا بامعنی ہونا ہے۔زندگی کو اہم،قابلِ توجہ یا بامعنی بنانے میں یقین کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔''امراؤ جان ادا'' کے کرداریقین کی دولت سے بالکل محروم دکھائی دیتے ہیں۔کسی غیر اہم معاملے کو اہم خیال کرنا خودفریبی بھی ہے اور یقین کی کم زوری بھی۔ انسان کسی ایسی چیز سے، جس کا اُسے یقین رہا ہو ،اگر مایوس ہوجائے،تو دوبارہ اُسی قسم کی صورتِ حال پیدا ہونے پر وہ اپنی رائے بدل لے گا۔چوں کہ اُس کے نزدیک ہر دل چسپ چیز ایک حقیقت ہوتی ہے اور وہ ہر چیز کو اُس کی ظاہری حالت پر قبول کر لیتا ہے، اِس لیے وہ اپنے تجر بات سے کچھ اخذ کرنے کی بجائے ترجیحات بدلنے لگتا ہے۔اُس کے تصور کے تئیں جو چیز اُس کی نظروں کے سامنے ہوتی ہے،وہی حقیقی ہوتی ہے۔درحقیقت اِس قسم کے کردار محض ایک خیالی دُنیا کے مکین اور غیر حقیقی کہلانے کے سزاوار ہوتے ہیں۔غیر حقیقی چیزوں کا اِدراک یوں بھی ممکن ہے کہ انسان اپنے اندر اِس بات کی گنجایش پیدا کرے کہ اِس دنیا میں وہ اکیلانہیں اور لوگ بھی رہتے ہیں ،جو اُن چیزوں کونہیں مانتے ہیں، جن کو وہ حقیقی خیال کرتا ہے،بل کہ وہ اُن چیزوں کو اہم سمجھتے ہیں جواُس کی نظر میں غیراہم ہیں۔یہ صورتِ حال غیر حقیقی دنیا کے مکینوں کے نظامِ عقائد کے متعلق سوال اُٹھانے لگتی ہے۔مفروضات کوتشکیک اور آزمایش کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتی ہے۔''امراؤ جان ادا'' سے یہ تاثر ملتا ہے کہ غیرِ حقیقت کی بنیاد کو اپنے آپ میں تلاش کیاجائے۔اس کے بعد خارج میں دیکھا جائے۔کائنات اور زندگی میں حقیقت کی تلاش کا سفراپنی حقیقت کی تلاش سے شروع ہوتا ہے۔''امراؤ جان ادا''میں طوائف ایک فردنہیں، ایک ایسی زوردار اقلیت ہے ،جوایسے افراد پر مشتمل ہے جن کے انفرادی نقائص دیگر لوگوں سے زیادہ

سنگین ہیں۔سماجی ضابطے اُن کے ذہنی عارضوں کے اظہار کو روک نہیں سکتے،وہ اپنے مسائل سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی کسی صلاحیت کو بروئے کارلائے بغیرمحض معجزوں کے منتظر ہیں ۔انجام ِ کار ایک مایوسی ،بے بسی اوربے عملی کا احساس باقی رہ جاتا ہے ۔یوں لگتا ہے کہ وہ معاشرہ اِس طرح کی مشکلات کے خلاف کسی چارہ سازی کے لیے تیار ہی نہیں،جوایک تہذیب کے لیےضروری ہوسکتی ہے۔یہ ہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے نزدیک ''امراؤ جان ادا'' کی جوشام ہے وہ ایک تہذیب کی شام ہے۔

''امراؤ جان ادا'' کی جزئیات یہ ثابت کرتی ہیں،انسان دیگرمخلوقات سے بہت زیادہ لچک پذیری کے سبب ہرقسم کے حالات میں زندگی گزارسکتا ہے۔بھوک ،غلامی اورتکلیف میں ماحول سے بھی ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے ۔مقتدرقوّتیں انسانوں پراپناتسلّط برقرار رکھنے اور استحصال کرنے میں کام یاب ہو جائیں تو اُن کے ظالمانہ نظام کے خلاف ردِّ عمل مؤخر ہوجاتا ہے۔مظلوم اورمحکوم خوف ،تشکیک، اوہام، تلذّذ اورتنہائی میں مبتلا ہوسکتے ہیں۔اگرکوئی بیرونی عوامل سامنے نہ آئیں تواُس ظالمانہ نظام کا تبدیل ہونا آسان نہیں ہوتا۔خوف ،تشکیک اورتنہائی کااحساس لوگوں کی اکثریت کومؤثر اور دانش مندانہ سرگرمیوں سےمحروم کر دیتا ہے۔معاشرہ ایک ایسی نا اہلی اور کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے کہ اُس کے بنیادی وظائف بھی شدیدطور پرمتاثر ہونے لگتے ہیں،یہاں تک کہ مذہبی سرگرمیاں بھی مضحکہ خیزصورت اختیارکر جاتی ہیں:

> ''خانم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کرتھی، امام باڑے میں پٹکے،شیشہ، آلات جو شے تھی، نادرتھی۔عشرۂ محرم میں دس دن تک روزمجلس ہوتی تھی۔ عاشورے کے دن سینکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ شکنی کی جاتی تھی۔ چہلم تک ہر جمعرات کومجلس ہوتی تھی۔میری سوز خوانی مشہورتھی ،ایسی ترکیبیں اورکسی کو کب یادتھیں۔ بڑے بڑے سوز خواں میرے سامنے منہ نہ کھول سکتے تھے۔ اِسی سوز خوانی کی بہ دولت نواب ملکہ کشور کےمحفل تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں پناہ نے خود میری نوحہ خوانی تعریف کی۔سرکارِشاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہرمحرّم میں عطاہوتا تھا۔مرثیہ خوانوں میں میرا اسم تھا۔شب کو اپنے امام باڑے میں ماتم کر کے مجھے درِ دولت پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔کوئی دو بجے رات کو وہاں سے آتی تھی۔''[۱۳]

ڈاکٹرظہیر فتح پوری کے خیال میں لکھنؤ کی تہذیب کا انحصارتین عناصر پر تھا،جنس ،فنون اور مذہب۔ڈاکٹرظہیر فتح پوری کی بات کو مدّ ِنظر رکھتے ہوئے، اِس بظاہر مضحک بباطن جھنجھوڑنے والی صورت ِحال اورلکھنؤی تہذیب کے تناظر میں رُسواکے یہ الفاظ''بڑا دقیق مسئلہ ہے۔''بہت کچھ کہہ رہے ہیں،جس پر پچھلے سو برس میں اُردو تنقید نے توجہ نہیں دی۔اِس فکری اورتہذیبی مسئلے کوانگریزی ناول نگار اور ناقدایلڈس ہکسلے (۱۹۶۳۔۱۸۹۴) کےمغربی تہذیب میں تفریح کے حوالے سے کیے گئے حیران کن اور مدلّل تجزیے کی مدد سے واضح کیاجاسکتا ہے۔ہکسلے کے خیال میں تہذیب ایک عالم ِسرشاری میں ڈوب کر اپنے لیے ہرطرح کے زہر پیدا کرتی ہے۔اُن میں تفریح ، نام کا زہر بظاہرسب سے بےضرر ہے اورجدیدتفریحات کا بھیانک زہراُس چیز سے پیدا ہوتا ہے کہ ہرقسم کی منظّم تفریح زیادہ سے زیادہ احمقانہ بنتی چلی جائے اور ہماری تہذیب اپنے آپ کو خود زہر دے رہی ہے، معلوم ہوتا ہے اس طرح تہذیب بہت جلد بوڑھی اور بوسیدہ ہو جائے۔طوائف اور اُس کا بالا خانہ آخرکوایک تفریح ہی تو تھے،جو''امراؤ جان ادا'' میں زیادہ سے زیادہ احمقانہ یا پھر لایعنی بنتادکھایا گیا ہے ۔امراؤ نے ایک مرحلے پر چند واقعات اور مثالوں کے ذریعےلکھنؤی تہذیب کے چند ایسے گوشے بے

نقاب کیے ہیں، جو اِس ناول کو تہذیب اور فکری حوالے سے بامعنی بنانے میں کام یاب رہے ہیں۔امراؤ بتاتی ہے کہ سب رنڈیوں کا قاعدہ ہے کہ ایک نہ ایک کو اپنا بنا رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا اُسی سے دل بہلایا۔ سودے سلف کا آرام رہتا ہے۔آدمی سے منگاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائے گا۔ یہ مارے خیر خواہی کے اچھی سے اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ بیمار پڑو تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے آرام دیتے ہیں۔ رات پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دوا بنا کے پلاتے ہیں۔ حکیم صاحب سے حال کہنے جاتے ہیں۔ دوست آشناؤں میں تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ چرکٹ پھنسا کے لا تے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ ہوا ، ناچ کا انتظام اپنے ذمے لے کے مجرے میں انھی کو لے جاتے ہیں محفل میں بیٹھ کر اہلِ محفل کو متوجہ کرتے ہیں۔وہ ناچ رہی ہے۔ یہ تال دیتے جاتے ہیں۔ ہر سم پر آہ کرتے ہیں ہر تال پر واہ واہ کہتے ہیں وہ بھاؤ بتا رہی ہے، یہ شرح کرتے جاتے ہیں۔ اُنھی کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانا ملتا ہے۔خاطر مدارات اور رنڈیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔انعام و اکرام سوا ملتا ہے۔اگر کسی رئیس سے ملاقات ہوگئی، اُنھی کی بدولت اُن کو لطفِ رقابت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ چاہتے ہیں کہ رنڈی اِن کو چاہنے لگے، اُدھر رنڈی جان جان کے اُن کا کلمہ پڑ ھ رہی ہے۔کبھی یہ فقرہ ہے،صاحب! میں اُن کی پابند ہوں،نہیں معلوم آپ سے کیوں کر ملتی ہوں۔ اب اُن کے آنے کا وقت ہے مجھے جانے دیجیے۔ وہ تو ہمیشہ کے ہیں۔ آپ اِس طرح کیا نباہیے گا۔تماش بین اُن سے دبتے رہتے ہیں ۔ اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی، یہ حمایت کو مستعد، شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات۔ بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔تماش بین ایک طرف، خود نائکہ پر دباؤ رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے کہ رنڈی اُن کو پیار کرتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کے ساتھ نکل کے گھر جا بیٹھے۔ امیر جان، کاظم علی پر مرتی تھیں۔ برسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ایک مرتبہ پانچ سو کے کڑے اُتار کے دے دیے اور صبح کو غل مچا دیا کوئی اتار کے لے گیا۔ ایک دفعہ جھالے کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑ کی دے دی اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے میلے میں کان سے گرگئی۔ اسی طرح ہزاروں روپے کا سلوک کیا۔ گھر بھر کی روٹیاں امیر جان کی بدولت تھیں،خورشید پیارے صاحب پر جان دیتی تھیں۔ بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا۔طبیعت میں سفلہ پن تھا،کسی پر بند نہ تھیں ۔ اوروں کا ذکر کیا،خانم صاحب پچاس برس کے سن میں میراولاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میر صاحب کا سن اٹھارہ انیس برس کا تھا،صورت دار تھے، جوان تھے، کسرتی بدن، اچھی اچھیوں کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غالب تھا، کیا مجال کوئی بات کر سکے۔ بے چارے غریب آدمی تھے، نانِ شبینہ کھتاج خانم کی بدولت سارا کنبہ پرورش پاتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ لگا کے شادی کردی، مگر برات کی رات کے سوا میر صاحب کو کبھی رات کو گھر میں سونا نصیب نہیں ہوا۔ دن رات یہیں رہتے تھے، گھڑی دو گھڑی کو گھر میں ہو آتے تھے۔ایک اور مرزا صاحب کہ ستر برس کا سن کمر جھکی ہوئی ،نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت ،خانم صاحب کے قدیم آشناؤں میں تھے۔ اب اُن سے کوئی واسطہ نہ تھا، مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔صبح شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے۔ کپڑا خانم بنوا دیتی تھیں۔ افیم، گنا، ریوڑیاں اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں ،خورشید جان غم زدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔ کیوں، پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے! اُن پر غم سوار ہے۔ خانم نے بہ راہِ فہمایش کہا: جاؤ چھوکریو! نہیں معلوم اِس زمانے کی محبتیں کس قسم کی ہیں! جیسی رنڈیاں ویسے اِن کے آشنا،اک ہمارا زمانہ تھا۔ دیکھو! (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ایک یہ ہی مرد آدمی بیٹھے ہیں! جوانی میں مجھ سے

آشنائی ہوئی، ماں باپ نے شادی ٹھہرائی، آپ مانجھے کا جوڑا پہن کے مجھے دکھانے آئے۔مَیں نے مانجھے کے جوڑے کے پُرزے پُرزے کردیے۔ ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی ،مَیں تو نہ جانے دوں گی۔اُس کو چالیس برس کا زمانہ گزرا۔آج تک گھر نہیں گئے۔کہو ہے کوئی ایسا تمھارا بھی؟ کہانی میں سب نے سر جھکالیا،مگر لکھنؤ میں کسی نے سر جھکایا یا نہیں،مندرجہ بالا صورتِ حال جان کر اور اُس کا احسن فاروقی کے ناول'' سنگم'' میں نواب سلمان افیون قدر بہا در کی کم سن طوائف مہ لقا سے ملاقات کا ماجرا پڑھ کر صرف اودھ ہی نہیں، پورے برّ عظیم میں مسلمانوں کے تہذیبی زوال ، اخلاقی افلاس اور بے معنویت کی ایسی دل دوز تصویر سامنے آتی ہے کہ ہر باشعور انسان کا سر جھک جاتا ہے:

''ہائے، ہائے، ہائے۔یہی ادائیں تو ہما را خون کیے دیتی ہیں گی اور وقت نہیں آتا، یا جناب امیرؓ! جلدی وہ گھڑی آئے ۔''لڑکی سیدھی ہو بیٹھی اور نواب صا حب کا منہ چڑھانے لگی ۔اُس کی ناک میں نتھنی تھی اور ماتھے پر ٹیکہ۔نواب نے کہا ''ارے ادھر تو آؤ جانِ جہاں ۔'دل رُبا کے اشارے سے لڑکی جا کر نواب صا حب کے گھٹنے پر بیٹھ گئی اور اُن کے منہ پر چٹہ چٹ پیا ر کیے۔نواب صا حب نے کہا ''ہو کوئی با دشاہ کہ کوئی فقیر ہو ۔بھی ہما ری تو با دشا ہت جب ہو گی جب (مہ لقا کہ نتھنی پکڑ کر) یہ نتھنی اُتر نے کا وقت آئے گا ۔''[۱۴]

لکھنؤی تہذیب کی انفعالیت اور بے معنویت کی چند اور شہادتیں جو تخیلی حقیقت ہوتے ہوئے بھی قاری کو حیران کیے دیتی ہیں:

'' جس رنڈی سے ایک شب کے لیے بھی واسطہ ہوگیا۔ اُس کی نائکہ کو مجمع ء عام میں امّاں جان کہنا اور جھک کے تسلیم کرنا عین سعادت مندی تھی۔ اِس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ یاروں پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ آپ یہاں مشرف ہو چکے ہیں۔''[۱۵]

نواب حسنو صاحب اور بسم اللہ جان کا مکالمہ بھی ایسی ہی صورتِ حال کا آئینہ دار ہے:

''غریب آدمی ہوں؟ یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کاٹ کاٹ کر گھر میں بھرلی اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ ایسے غریبوں کو تاؤ تو نومن چربی سے کم نہ نکلے۔حسنو: ہیں ہیں! تم تو ایسا نہ کہو۔ وہ نواب کے پاس تھا ہی کیا جو میں گھر بھر لیتا۔ کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا؟ بسم اللہ: آپ کی والدہ بوا فرخندہ، نواب سرفراز محفل کی خاصہ والیوں میں تھیں نا؟ میر حسنو: (جھینپ کر) وہ جو کوئی ہوں، جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا تو زیور چھوڑ کر مری ہیں۔ بسم اللہ: وہ آپ کی بیوی لے کے یار کے ساتھ نکل گئیں آپ کے پلے کیا پڑا؟ میرے آگے ذرا شیخی نہ بگھاریے، مجھے رتی رتی، آپ کا حال معلوم ہوا۔حسنو: تو والد کے پاس کچھ کم تھا؟ بسم اللہ: والد آپ کے نواب حسن علی خان کے چڑی ماروں میں تھے۔حسنو: چڑی ماروں میں؟ بسم اللہ: اچھا وہ مرغ بازوں میں سہی۔حسنو: مرغ بازوں میں تھے؟ اچھا وہ بٹیر باز ہی سہی، تھا تو چڑیامار کا کام۔حسنو: لیجیے ،آپ تو مذاق کرتی ہیں۔ بسم اللہ: میں کھری کہتی ہوں، اِسی سے بُری مشہور ہوں اور کہتی بھی نہ، تمھارے چھچھورے پن پر جی جل گیا۔''[۱۶]

خود فریبی سے خود اذیتی کی حد کو پہنچنے والی حماقتوں سے زندگی کے دیگر پہلو بھی آلودہ نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھنؤ شہر اور اُس کی معاشرت کو اِس ناول کا مرکزی نکتہ خیال کرتے ہیں،اِس تناظر میں بات کی جائے ،تو کہانی کارنے یہاں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ لکھنؤ کے مکینوں میں اور زندگی میں ایک بُعد پیدا ہو گیا ہے، جو ایک بہت بڑا تہذیبی مسئلہ تھا۔اہلِ لکھنؤ بظاہر زندگی کا اعلان کر رہے تھے،لیکن متنی حقائق اُس کے برخلاف تھے۔ڈاکٹر ظہیر فتح پوری کے بیان کردہ لکھنؤ ی تہذیب کے تین اہم ترین عناصر یعنی جنس ،فنون اور مذہب کی علامتیں،طوائف ،اُس کا بالا خانہ اور مولوی تینوں متن میں مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکے تھے۔ شاعری کی صورتِ حال کی یہ تشکیل بھی اُس تہذیب کے سطحی ، بوسیدہ اور زوال پذیر ہونے کا انوکھا نمونہ بن جاتی ہے ۔آغا صاحب متخلص بہ قزّاقؔ'' کا کلام اور تخلص بجوِ ملیح کی ایک ایسی حیرت انگیز مثال ہے، کہ لکھنؤی تہذیب کی ادبی اور سیاسی جہات اور بانک پن کی اصلیت آشکار ہو جاتی ہے:

افسوس! اُستاد مرحوم زندہ نہ ہوئے ،نہیں تو اُن شعروں کی کچھ داد ملتی ۔اب سمجھنے والوں میں کون رہ گیا ہے۔ خیر آپ یہ مقطع سن لیجیے۔طبیعت کو کلفت ہوگئی، کوئی قدر دان نہیں ہے۔بس اے قزّاق بس! طبعِ قیامت خیز کو روکو/غضب ہوجائے گا فوجِ مضامیں میں جو ہل چل ہو/ معاف فرمایئے گا، ہے تو کچھ ایسا ہی' مگر کچھ ایسا نازیبا نہیں ہے۔ ایک تو خاندانی اعتبار سے' اِس لیے کہ فدوی کے آباؤ اجداد دشتِ قفچاق میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ دوسرے اس سبب سے کہ اُستاد مرحوم سارقؔ تخلص فرماتے تھے اور یہ کچھ ایسا نامناسب بھی نہ تھا، اِس لیے کہ (اُن کی روح نہ شرمندہ ہو) عمر بھر اگلے شاعروں کے مضمون چرا چرا کر شعر موزوں فرمایا کیے۔ سارا دیوان ملا خطہ کر لیجیے، شاید ہی کوئی شعر نیا ہو۔ جب اشہبِ خامہ کی لگام میرے دستِ اقتدار میں آئی تو مَیں نے سرقے کو اپنی شان کے منافی سمجھ کر قزاق تخلص رکھ لیا۔ کچھ نہ سہی اس میں ایک طرح کا بانکپن تو ہے ۔ بندے کا یہ دستور رہا ہے اور رہے گا کہ شعرائے ماضی و حال و استقبال کے مضامین زبردستی چھین کر اپنے قبضہ تصرّف میں کروں گا۔'' [۱۷]

ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے لکھنؤی تہذیب میں انتظامی یا دفاعی معاملات کے بارے میں نہیں بتایا کہ اُدھر ایسے شعبوں کی کس قدر اہمیت تھی؟ قزّاقؔ کے مقطعے کے دوسرے مصرعے میں' 'غضب ہوجائے گا فوجِ مضامیں میں جو ہل چل ہو'' کہہ کر جو بلواسطہ اشارہ کیا ہے۔وہ بیگم صاحبہ کے قیصر باغ سے نکلتے سَمے کے ماجرے میں بلاواسطہ طنز کی صورت اختیار کر جاتا ہے:

''راستے نمک حرام اور بزدل افسرانِ فوج کے غمزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ 'لو صاحب اِن کے راج میں ہم پیدل چلیں' دوسرے صاحب فرماتے ہیں' بھلا کھانے کا تو انتظام درست ہوتا' تیسرے صاحب افیم کو پیٹ رہے ہیں۔ چوتھے اپنی جان کو رو رہے ہیں کہ حُقہ وقت پر نہیں ملا۔'' [۱۸]

لکھنؤ ی تہذیب کی یہ وہ جہات ہیں،جو ہندوستان کے متعلق بظاہر کولونیئل نقطہ ءِ نظر کی تائید کرتی نظر آتی ہیں،ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اپنے مشہور مضمون میں اِس ناول کو زوال کی علامت قرار دیا ہے ۔ پروفیسر احتشام حسین کی رائے بھی کم و بیش یہ ہی ہے :

''لکھنؤ کی تہذیب میں ایک بیمار حسینہ کا حسن تھا، توانائی اور بھرپور زندگی سے خالی ، پھر اُس کی ٹکر بھی بیرونی عناصر سے ہوتی رہی، اِس لیے اُس کے نقوش جلد دھندلے ہوگئے۔''[۱۹]

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے گوہر مرزا کی پیدائش کو ایک حادثہ کہا ہے۔جس کی بدولت اُس میں زندگی بھی ہے اور زندگی سے انتقام لینے کا جذبہ بھی۔ وہ ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جس کا کوئی وطن نہیں، کوئی خاندان نہیں ، جسے زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں، یہ نسل اُن نوابین کی بدولت وجود میں آئی ، جو زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہے تھے۔فقط گوہر مرزا پر کیا موقوف، یہاں تو لکھنؤی معاشرہ اور تہذیب بھی ایک حادثہ ہی معلوم ہوتی ہے۔جس کے اثرات خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کے اَسرار میاں کی صورت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔یہاں اِس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے، جسے نذیر احمد اور رسوا کے مطالعے میں اُردو تنقید نے ہمیشہ نظر انداز کیا ہے وہ یہ کہ نذیر احمد کے متن میں تخلیق کار بیمار محسوس ہوتا ہے، جب کہ رُسوا کے ہاں معاشرہ بیمار نظر آتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں لکھنؤ کو'' سرابوں کا شہر'' کہا ہے،اُس کی تصدیق محولہ بالا اقتباسات سے خوب ہوتی ہے۔مولانا صلاح الدین احمد نے کتھن کی تنقید پر زیادہ نہیں لکھا،مگر جو لکھا سنجیدگی سے لکھا،تاہم'' امراؤ جان ادا'' پر اُن کا تبصرہ غیر متوازن ہے۔:

'''امراؤ جان ادا'' اُردو کا پہلا بے مقصد ناول ہے اور یہ ہی اُس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔'' [۲۰]

یہ درست ہے کہ رُسوا، نذیر احمد یا اُن کے تتبع میں ناول لکھنے والے ادیبوں کی طرح کسی باقاعدہ اصلاحی پروگرام کے مؤید نہیں تھے،مگراَن گنت تہذیبی اور فکری سوالوں سے آراستہ ایک خاص اسلوب رکھنے والا فن پارہ لاشعوری یا اتفاقی نہیں ہوسکتا ۔ ایک محتاط تحریر کو بے مقصد کہنے سے بات نہیں بنتی۔ہر اچھے فن پارے کی طرح یہاں بھی مصنف کے مقاصد فنی مہارت میں مضمر ہیں، جو،''حضرات !ایک ضروری اعلان سُنیے !''قسم کی چیز نہیں بنے۔ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری نے اپنے مقالے میں رُسوؔا کا ایک بڑا ہی معنی خیز جملہ نقل کیا ہے:

''ہم نے اپنی ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ بنا دیا ہے۔''[۲۱]

رُسوا کی ناول نگاری کے بارے میں غیر معمولی پیش بینی کا اثبات نہ صرف جورج سٹر کے اِس قول سے ہوتا ہے کہ ناول اور تاریخ فرسٹ کزن ہیں،بل کہ ٹیری ایگلٹن ایسے جغادری ناقد کی رُسوا سے سو سال بعد کی گئی اِس بات سے بھی تائید ہوتی ہے، جو کہتے ہیں:

''ناول ایک ایسی صنف ہے کہ جس میں تاریخ پورے طور پر شامل ہوتی ہے۔'' [۲۲]

رُسوا کی ناول کے بارے میں جو تنقیدی تحریریں سامنے آئی ہیں،اُن کے پیشِ نظر وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ رُسوا کو اِس صنفِ ادب میں مضمر بھرپور امکانات کا فکری ،تہذیبی ،تکنیکی اور اُسلوبیاتی حوالوں سے بخوبی احساس تھا ،یہ اور بات ہے کہ خود ناول نگار کی ترجیحاتِ حیات میں ناول نگاری دیگر سرگرمیوں کے مقابلے میں بہت کم اہمیت رکھتی تھی، یہ ہی وجہ ہے کہ رُسوؔا کے تمام ناولوں کا معیار یکساں نہیں۔تہذیبی اور فکری حوالے سے رُسوا کی یہ تکنیک بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ لکھنؤی سماج کی اُتھلی سطح کی نشان دہی کے لیے کبھی وہ اکبر علی خاں جعل ساز کے اعتقاد کو ایک مثال بناتے ہیں جسے تعزیہ داری سے عشق تھا۔ رمضان اور محرّم میں نیک کام کرکے سمجھتا تھا کہ سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہوگئی ۔ یہ بتاتے ہوئے راوی

کا کہنا کہ یہ صحیح ہو یا غلط اُن کا اعتقاد یہ ہی تھا۔صورتِ احوال کو دانستہ مضحکہ خیز بنانے کی کارگرترکیب ہے ۔ مرزا رُسوا نے اِس ناول میں خود کو جس طرح ایک کردار بنایا ہے ، یہ انوکھا تجربہ بھی ناول کو مؤثر ،مختلف اور مقبول بنانے کی ایک زبردست تکنیک ثابت ہوا۔ بہت ممکن ہے اِس باب میں فارسی اُردو شاعری میں تخلص کے استعمال کی روایت سے بھی استفادہ کیا گیا ہو، کیوں کہ وہاں بھی تخلص ہمیشہ محض شاعر کی ذات کی نمایندگی نہیں کررہا ہوتا۔تخلص کبھی کردار ہوتا ہے ،تو کبھی ایک مخاطب،کبھی محض ایک متکلم،رُسوا کی اِس تکنیک کی طرف اسد الدین،علیسن سفادی اور آصف فرخی کے علاوہ کسی نقاد نے پوری طرح توجہ نہیں دی،آصف فرخی کا یہ تجزیہ بہت صائب ہے:

''مرزا رُسوا کو بیک وقت کردار اور ناول نگار بنا کر ناول نگار نے جو پیچیدہ فنی ترکیب برتی ہے۔اُس سے ناول کی افسانویت fictionality کی نفی نہیں ہوتی۔جس طرح بعض نقادوں نے' اِس کو واقعیت کا پردہ سمجھ کر ہٹانے کی کوشش کی ہے،بل کہ اُس کے ذریعے (رُسوا نے)افسانویت کے تشابہ کوVersimilitude قرینِ قیاس بنایا ہے اور اِس سے ناول کے Suzet میں کئی ایک فنی مقاصد حل کیے ہیں۔''[۲۳]

رُسوا ایک کردار اور بیان کار کے طور پر بیانیے حقیقت کی ترجمانی کے لیے کیسے کیسے پینترے بدلتے ہیں،اُس کی مثال عورتوں کے متعلق اُس لکھنوی تہذیب کے عجیب وغریب رویّوں کو بے نقاب کرنے والا یہ اقتباس دیکھا جا سکتا ہے :

''نیک بخت عورت کو مَیں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں، خواہ وہ کسی قوم و ملّت کی کیوں نہ ہو اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے ،جو اُس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں ۔ جو لوگ اُس کو ورغلانے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، میری رائے میں قابل گولی مار دینے کے ہیں ،مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک گناہ نہیں ہے ۔'' [۲۴]

رُسوا طوائف بازی اور تماش بینی کو دہلی اور لکھنؤ کی ''تباہی اور بربادی کا باعث' 'بھی بتاتے ہیں اور مرد عورتوں کے معاملے میں بے وقوف کیوں بنتے ہیں،ایسے بظاہر سادہ اور بباطن ہت پیچیدہ سوال کا ایسا جواب بھی سامنے لاتے ہیں،جو نفسیاتی اعتبار سے قاری کو متاثر کرتا ہے اور فن پارے کو تہہ دار بناتا ہے :

''انسان کے مزاج میں جدت پسندی ہے ۔ ایک حالت میں زندگی بسر کرنے سے خواہ وہ کسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو طبیعت اُکتا جاتی ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کا تغیّر اُس کی حالتِ زندگی میں پیدا ہو ۔ شاہد ان بازاری کے ساتھ معاشرت کرنے میں اُسے ایک قسم کی نئی لذّت ملتی ہے، جو کبھی اُس کے خیال میں نہ تھی ۔ یہاں بھی ایک ہی کے تعارف پر اکتفا نہیں کرتا،بل کہ جدّت کی تلاش میں روز نئے کمروں میں پہنچتا ہے اور نئے گھر دیکھتا پھرتا ہے ۔''[۲۵]

بیسویں صدی عیسوی میں علمِ نفسیات کے فروغ کے سبب آج اُردو زبان میں بھی انسان کے کردار اور رویّوں کی تشکیل سے متعلق کتھن اور علمی کتب میں بہت مواد ملتا ہے،مگر اُنیسویں صدی میں طوائف بازی کا ایسا نفسیاتی مطالعہ اُردو زبان اور ادب کے لیے بالکل ایک نئی بات تھی۔یہ وہ خصائص ہیں،جو ایک فن پارے کو محتاط اور معتبر سماجی مطالعے کے

درجے تک پہنچا دیتے ہیں:

''حسنِ معاشرت کے قانون نے اِس امر کو معیوب قرار دیا ہے ۔ جو شخص ایسا کرتا ہے، اُس کی عزیز و اقارب دوست احباب ملامت کرتے ہیں ۔ اِس خوف سے اکثر کی جرأت نہیں ہوتی ،مگر جب اخوان الشیاطین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ طرح طرح کا لذّتوں کا ذکر کر کے ایک عجیب قسم کا شوق اُن کی طبیعت میں پیدا کر دیتے ہیں ۔ اِس لیے وہ خوف اُن کے دل سے نکل جاتا ہے ۔آپ کو اِس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہوگا کہ جو لوگ پہلے پہل رنڈی کے مکان پر جاتے ہیں۔ اُن کو اِخفائے راز کا کس قدر خیال ہوتا ہے۔ کوئی دیکھتا نہ ہو کوئی سن نہ لے ،دو آدمیوں کے سامنے تو بولنے کا کیا ذکر، تخلیہ میں بھی منہ سے بات نہیں نکلتی ،مگر رفتہ رفتہ یہ حالت بالکل زائل ہو جاتی ہے ۔ خلاصہ یہ کہ چند ہی روز میں پورے بے غیرت ہو جایا کرتے ہیں ۔ پھر کیا ہے دن دہاڑے سرِ چوک، رنڈیوں کے کمروں پر کھٹ کھٹ کر کے چڑھ جانا گاڑی میں کھڑکیاں کھول کے ساتھ بیٹھ کر سیر کرنا ،ہاتھ میں لے کے میلے تماشوں میں لیے پھرنا۔ اُن سب باتوں کو فخر سمجھنے لگتے ہیں ۔''[۲۶]

ایک خاص پس منظر میں دیہی اور شہری ماحول کا یہ فرق حقیقت کے عین مطابق معلوم ہوتا ہے:

'' دیہات اور قصبات میں ایسے شریر لوگوں کی صحبت کم ملتی ہیں جو نوجوانوں کو اِن بدکاریوں پر آمادہ کریں دوسرے وہاں کی رنڈیوں کو اِس قدر احتیاط حاصل نہیں ہے ۔اِس لیے وہ رؤسا اور زمین داروں کی مطیعِ فرمان ہوتی ہیں اور بہت ڈرتی ہیں، کیوں کہ ان کا آزوقہ ،بل کہ زندگی اُن کے دستِ قدرت میں ہے ۔ اِس لیے اُن کی اولاد سے بہت ہی چھپے چوری ملتی ہیں اور شہروں میں تو آزادی ہے کون کس کا دباؤ مانتا ہے ؟ اُسی کا یہ نتیجہ ہے ۔''[۲۷]

۱۸۵۷ء میں ہندیوں کی انگریزوں کے مقابلے میں مدافعت کی ایک غیر منظّم کوشش، جو محمّد حسن عسکری ،سلیم احمد اور انتظار حسین کے حواس پر بُری طرح چھائی ہوئی ہے۔ جس کے بیان میں وہ غلو کو جائز سمجھتے ہیں۔ اُس سے متعلق امراؤ کا یہ جملہ تو سرسیّد کی ہم نوائی کر رہا ہے،نہیں معلوم ،اِس پر دبستانِ علی گڑھ کو خوش ہونا چاہیے یا نادم!

'' غدر ہونے کو تھا۔ بدمعاشوں نے سر اُٹھایا تھا۔ ملک میں اندھیر مچا ہوا تھا۔''[۲۸]

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے ناول میں معنی خیزی کے حوالے سے بعض نکات کی نشان دہی کی ہے۔ جو سنجیدہ ناول کے مطالعے میں مددگار ہو سکتے ہیں:

''سوال زندگی پر کوئی ٹکے بندھے فلسفہ کو ٹھونسنے کا نہیں ہے،بل کہ ناول سے یہ معلوم ہو کہ زندگی کو غور سے دیکھنے والے کے سامنے ایک فکر کی دنیا بھی اُبھر رہی ہے۔ ناول نگار کہیں کہیں سے لائے ہوئے معنے نہیں بتا رہا ہے،بل کہ کہ زندگی خود ایک معنے دے رہی ہے۔ جس کو ناول نگار بیان کرتا جا رہا ہے ۔ یہ بڑے پہلو دار ہوتے ہیں اور پڑھنے والا اپنے ذہن کی رسائی کے حساب سے اپنے موافق اُنھیں ڈھال بھی سکتا ہے ۔ یہ بھی امکان ہے کہ مفکر پڑھنے ولا اُس سے اختلاف بھی کرے اور اُسے اپنے تجربے سے مختلف پائے، مگر

اُس کا یہ محسوس کرنا ضروری ہے کہ کوئی چیز اُس پر ٹھونسی نہیں جارہی ہے۔مفکر ناول نگار اصل میں اپنے تجربے کے اندر ایک معنے تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔معلوم ہوتا ہے وہ کوئی سائنسی تجربہ کررہا ہے اور پڑھنے والا اُس کے ساتھ اُس تجربے کے مدارج طے کرتا ہوا ایک گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔''[۲۹]

ناول میں معنی خیز ی کے حوالے سے بیان کردہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے مذکورہ نکات کے کئی فکرانگیز نمونے ''امراؤجان ادا'' کے بیانیے میں ملتے ہیں۔جن سے قاری کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ فن پارہ اپنے عہد کی دیگر تخلیقات سے اِس قدر مختلف کیوں ہے:

''جن لوگوں میں مَیں نے پرورش پائی تھی، جو اُن کا طریقہ تھا وہی میرا بھی تھا۔مَیں نے اُس زمانے میں کبھی کسی مذہب عقیدے پر غور نہیں کیا اور میرا خیال تھا کہ کوئی ایسی حالت میں نہ کرتا۔ارضی و سماوی حادثے جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، مگر جب واقع ہوتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے۔مثلاً زور سے بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، آندھیوں کا آنا، اولوں کا گرنا یا زلزلے کا آنا، سورج گہن یا چاند گہن، قحط سالی، و با وغیرہ ایسے اُمور اکثر خدائی غضب کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ پھر مَیں نے دیکھا کہ لوگوں کے بعض اعمالوں کی وجہ سے وہ رفع دفع ہوگئیں، مگر یہ بھی دیکھا کہ بہت سی آفتیں، دعا، تعویذ، ٹوٹکے کسی بات، سے نہ ٹلیں۔ ایسے اُمور کو لوگ خدا کی مرضی ،تقدیر آسمانی کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں۔مذہبی احکام مجھ کو مفصل نہ پہنچے تھے اور نہ ثواب عذاب کا مسئلہ اچھی طرح سمجھایا گیا تھا۔ اِس لیے ان باتوں کا اثر میرے دل پر نہ تھا۔ بے شک اُس زمانے میں میرا کوئی مذہب نہ تھا۔صرف جو اور لوگوں کو کرتے دیکھتی تھی وہی آپ بھی کرنے لگتی تھی۔ اُس وقت میں میرا کوئی مذہب ہی نہ تھا۔ تقدیر پر مَیں بہت ہی شاکر تھی۔ جو کام مَیں کاہلی سے نہ کرسکتی تھی۔یا میری بے وقوفی سے بگڑ جاتا تھا۔اُس کو تقدیر کے حوالے کر دیتی۔ فارسی کتابوں کے پڑھنے سے آسماں کی شکایت کرنے کا مضمون میرے ہاتھ آگیا تھا۔اب میرا کوئی مطلب فوت ہو جاتا تھا، یا کسی اور وجہ سے مجھے ملال پہنچتا تھا۔تو جا و بے جا فلک کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔[۳۰]

ناول میں تکنیک سے مراد وہ تمام تدابیر ہیں، جن کے ذریعے واقعات کو سمیٹنے ،پھیلانے اور مواد کو بہ تر انداز میں سامنے لانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ رسوا ناول نگاری کے اِس ناگزیر تقاضے سے بخوبی آگاہ ہیں۔''امراؤجان ادا'' میں مواد کو بیانیے میں سلیقے سے برتنے کی کئی مثالیں ملتی ہیں، جیسے تصوّرِ ماضی کی وضاحت کے لیے یہ مدلّل انداز اختیار کیا گیا ہے:

''مولوی صاحب! بوا حسینی اور بڈھے بڑھیاں جب اگلے زمانے کی باتیں کرتے تو اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس زمانے سے بہت ہی اچھا تھا۔ اِس لیے اُن کی طرح مَیں بھی اُس زمانے کی غائبانہ تعریف اور زمانۂ موجودہ کی بلاوجہ مذمّت کیا کرتی تھی۔مَیں کم بخت اِس بات کو نہ سمجھی کہ بڈھے بڈھیاں جو اگلے وقتوں کی تعریف کرتے ہیں۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ اپنی اپنی جوانی کے دن سب کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، اِس لیے دُنیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔خود زندہ جہان زندہ ۔خود مردہ جہان مردہ ۔''[۳۱]

انسانی مقاصد کے محرکات ،انسان کے افعال متعین کرتے ہیں اور اِن کے توسط سے انسان کی ذات کی مکمل فطرت آشکار ہوتی ہے۔انسانی زندگی میں محبت کا جذبہ سب سے بڑا محرّک تسلیم کیا جاتا ہے۔ انسان کا تصوّرِ حسن اِسی کی پیداوار ہے۔علم کا تعلق ذات کی مفکرانہ زندگی سے ہے اور علم اُس کا صرف ایک پہلو ہے۔ جس طرح علم کا تعلق سچائی سے ہے،اِسی طرح ہماری ذات میں ایک جمالیاتی تفکر بھی پایا جاتا ہے اور اِس کا تعلق حسن سے ہوتا ہے، جو ایک مخصوص خارجیت سے حاصل ہوتا ہے،لیکن عملی زندگی کا رُتبہ بلند تر ہے اور اِس اعتبار سے اہم ہے کہ اُس سے فکری سرگرمیوں کی تکمیل ہوتی ہے۔رُسوؔا کے قابلِ قدر فن پارے میں حُسن اور محبت کے تئیں بعض اہم نکات ملتے ہیں۔جو اُردو ناول نگاری میں اپنی نوعیت کا اوّلین تجربہ تھے۔جنھیں ناول نگار کی نفسیاتی گہرائی کی دلیل بھی کہا جاسکتا ہے:

''اکثر مرد یہ کہیں گے کہ عورتیں حسین ہوتی ہیں۔مَیں اِس کی قائل نہیں۔ درحقیقت نہ مرد ہی بجائے خود حسین ہے نہ عورت،بل کہ ہر ایک کو ایسا حسن عنایت ہوا ہے۔ جو دوسرے کو اچھا معلوم ہو۔ یوں تو مرد عورت جس کا ناک نقشہ اچھا ہوتا ہے۔ سب اُسے پسند کرتے ہیں،مگر اصل قدر دان مرد کے حُسن کی عورت اور عورت کے حُسن کا مرد ہے۔ ایک خوب صورت عورت، دوسری عورت کے سامنے اُس خوش رنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے۔ جس میں خوش بو نہ ہو،بل کہ ایک بدصورت مرد بھی، خوب صورت سے خوب صورت عورت کی رائے میں خوش بودار پھول کی طرح دل پسند ہے۔اگرچہ اُس کی شکل اور رنگت میں کوئی ندرت نہ ہو۔محبت کے باب میں غلطی صرف ایک ہی طرف سے نہیں ہوتی،بل کہ دونوں اِس باریکی کو نہیں سمجھتے ۔ اِن دونوں محبتوں کی اصلیت میں فرق ہے۔ جس نگاہ سے مرد عورتوں کو دیکھتے ہیں، اُس نگاہ سے عورت مرد کو دیکھتی ہی نہیں۔عورتوں کی محبت کرنے کا اندازہ اُس مرد میں ایک حد تک پایا جاتا ہے۔ جو کسی مال دار عورت کے دامنِ دولت سے وابستہ ہے یا جس کا سن بہت کم ہے،مگر کوئی سن رسیدہ عورت اُن کو کیوں چاہنے لگی؟اِس میں شک نہیں کہ عورتیں جو ان مرد سے بہ نسبت بڈھوں کے زیادہ محبت رکھتی ہیں، مگر اِس کی وجہ بھی محض حسن و جمال نہیں ہے،بل کہ وجہ یہ ہے کہ عورت ضعیف القویٰ ہے، اِس لیے وہ ہر حالت میں اپنے حمایتی کو بہت دوست رکھتی ہے۔ تاکہ وقتِ ضرورت اُس کو خطرے سے بچا سکے۔ پس جو ان سے بہ نسبت بڈھے کے اُس کی زیادہ توقع ہوسکتی ہے اور حسن و جمال اِس خوبی کے ساتھ مل کر اُس کے وصف کو رونق دے دیتا ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ مرد کی محبت میں صرف لذّت حاصل کرنا مقصود ہے اور عورت کی محبت میں الم سے محفوظ رہنا اور لذّت حاصل کرنا دونوں غرضیں شامل ہیں۔ چوں کہ یہ مشہور ہے کہ محبت بے غرض ہونا چاہیے اور عورت کی محبت میں اُس کا زیادہ لگاؤ ہے۔ لہٰذا وہ اُس کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ جو امور مَیں نے اِس موقع پر بیان کیے ہیں اُس میں اکثر باتوں کا امتیاز نہ مردوں کو ہوتا ہے، نہ عورتوں کو،مَیں تو اسے تسلیم کر لوں گی اور یہ کہوں گی کہ یہ باتیں اصل فطرت سے مرد عورت کے خمیر میں داخل ہیں۔ضروری نہیں کہ انھیں اُس کا شعور بھی ہو۔مَیں نے عمر بھر کے تجربے کے بعد یہ اُمور دریافت کیے ہیں اور میرے ساتھ جو شخص اِس پر غور کرے گا، وہ اِس سمجھ سکتا ہے۔''[۳۲]

''بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے تھے کہ عورت کو خوشامد اور اظہارِ عشق پسند ہے ،بے شک پسند ہے،مگر

شرط یہ ہے کہ اِس میں ذرا بھی کمینہ پن نہ ہو۔ جو لوگ رنڈیوں کا گہنا تاکتے ہوئے آتے ہیں۔ جن کے ہر کنائے سے یہ مدّعا نکلتا ہے کہ ہمیں چاہو، خدا کے لیے چاہو، اور ہمارے گھر پڑ جاؤ۔ جو کچھ تمھارے پاس ہے ہمیں دے دو اور ہمارے گھر کی ماما گیری کرو، روٹیاں پکا پکا کے کھلاؤ، ہماری اور ہمارے بال بچوں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ ہر شخص کا حسن حضرتِ یوسف کا معجزہ نہیں ہے کہ ہر ایک عورت اُس پر جان دینے لگے۔ مرد عورت سے اور عورت مرد سے محبت کرتی ہے، مگر اس محبت میں اکثر اغراضِ ذاتی کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ بے غرض محبت جیسے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یہ صرف قصّے کہانی میں سنی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یکم طرفہ محبت نہیں ہوتی۔ ہم نے اِسے بھی آنکھوں سے دیکھا ہے، مگر اِس کو خللِ دماغ سمجھنا چاہیے۔ پھر کیا ضروری ہے کہ مرد عورت دونوں دیوانے ہوں۔''[۳۳]

باریک بین فن کار عمومی مشاہدے اور سادہ سی حقیقت کو ایک خاص معنویت دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ جس سے فن پارہ عام سطح سے بلند ہو کر خاص تأثر کی علامت بن جاتا ہے۔ اِس کی ایک مثال چھوٹے سے بے تکلف مشاعرے کا انتظام ہے، جو تہذیبی طرزِ احساس کا عجیب و غریب نمونہ بن جاتا ہے:

'' گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی دن رہے سے چھڑکاؤ ہوا تھا، تاکہ شام تک زمین سرد ہو جائے۔ اُسی پر دری بچھا کے اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ اُن پر بالو کے آپ خورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذ کی ہنڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوش بودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ خمے حقوں کے نیچے میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دیے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ اِس لیے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک سفید کنول دورے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب میر صاحب، آغا صاحب، خاں صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب، وغیرہ وغیرہ تشریف لائے۔ پہلے شیر فالودے کے ایک ایک پیالے کا دور چلا، پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔''[۳۴]

محمّد حسن عسکری نے بیسویں صدی کے ناول کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اِس طرف توجہ دلائی ہے کہ انسانی تقدیر کے مسئلے کی تفتیش میں بیسویں صدی کا ناول شاعری سے بھی آگے رہا ہے۔ انسانی اقدار کی نئی تشکیل اور انسان کی تعریف متعین کرنے کی مہم اِس دور کے ناول نے اِس طرح اپنے ذمے لی ہے کہ نفسیات اور فلسفہ ایسے علوم ناول سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اِس تناظر میں اُنیسویں صدی میں لکھے جانے والے اُردو ناول ''امراؤ جان ادا'' میں اُٹھائے گئے اِس طرح کے سوالات اپنے اندر مفاہیم کی کئی فکر انگیز سطحیں رکھتے ہیں، جن سے اُردو ناول کا دامن پہلے خالی تھا:

''تقدیر اور تدبیر کے مسئلے میں مَیں بہت دن چکر میں رہی۔ آخر معلوم ہوا کہ جن معنوں میں لوگ اِس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں۔ وہ بالکل دھوکا ہے۔ اگر اِس سے یہ مراد ہے کہ خدا کو ہماری سب باتوں کا علم ازل سے ہے۔ تو اس میں کچھ شک نہیں۔ وہ کافر ہے، جس کو اِس کا اعتقاد نہ ہو، مگر لوگ تو معاذ اللہ اپنے تمام افعالِ ناشائستہ کے بُرے نتائج کو تقدیر کی طرف نسبت دیا کرتے ہیں۔ اِس سے خدا کی قدرت پر الزام آتا

ہے، یہ بالکل کفر ہے۔''[۳۵]

''مَیں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اُس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ جوان ہوگئیں، ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی۔ ماں باپ نے جہاں چاہا جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا، نہ صورت شکل دیکھی نہ مزاج کا حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی نکل کھڑی ہوئیں یا جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا رانڈ ہوگئیں ،مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑ دیا، جہاں سوائے گم راہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔''[۳۶]

''بے چارے غریب کم مایہ ، جاہل ، بدتمیز، بدصورت بھی تو آخر خدا کے بندے ہیں۔کبھی تو اُن کے حالات، خیالات، اُن کی خواہشوں کی طرف التفات کرنا چاہیے۔''[۳۷]

رُسوا کے نامکمل ناول افشائے راز عرف غریب خانہ مطبوعہ ۱۸۹۶ء کا یہ اقتباس ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول جدید دور کے کسی نقاد کی عبارت سے نہیں لیا گیا ،بل کہ یہ اُس ادیب کے خیالات ہیں،جس نے تمام عمر نہ خود کو ادیب سمجھا نہ نقاد۔

''یہ کچھ ضروری نہیں کہ ہر ناول نویس کے لیے ایسے اشخاص کی سوانح عمری کی تفتیش کریں۔ جن کے حقیقی حالات ہم نہیں معلوم کرسکتے۔ خود ہمارے عزیزوں میں ایسے لوگ ہیں جن کے حالات وحقیقت بہت ہی عجیب وغریب ہیں ،مگر اُن کے سننے کی ہمیں پروانہیں کیوں کہ ہمیں سکندرِ اعظم ،محمود غزنوی ، ہنری ہشتم ،ملکہ این،نپولین بوناپارٹ کی تاریخوں کے ضخیم مجلّات سے فراغت ہی نہیں ملتی۔''[۳۸]

مرزا ہادی رُسوا ناول کی صنف کے امکانات سے اچھی طرح واقف تھے ،انھوں نے ''شریف زادہ''میں جس طرح ایک نیا تصوّرِ انسان دینے کی کوشش کی ہے یا اپنی کہانیوں کو اپنے عہد کی تاریخ قرار دیا ہے ،اُس کی بنا پر عہدِ حاضر کے ممتاز ترقی پسند نقاد ٹیری ایگلٹن کا یہ کہنا سمجھ میں آتا ہے :

''بیانیہ، ڈرامائی عمل اور مادی دُنیا کے تصرّف میں دل چسپی ، ناول کو کلاسیکی رزمیہ سے مشابہ بناتی ہے۔ البتہ ماضی کے بجائے، حال کو پیش کرنے کی وجہ سے، یہ اُس سے مختلف بھی ہے، کیوں کہ ناول جیسا اِس کے نام ہی سے ظاہر ہے، سراسر ایک ''ہم عصر'' صنف ہے اس حد تک ''ہومر'' کی نسبت یہ ''دَ ٹائمز'' کے ساتھ زیادہ مماثلت رکھتا ہے، جب یہ ماضی کی طرف رجوع کرے تو یہ اکثر اُسے حال کی ماقبل تاریخ کے طور پر ہی لیتا ہے، حتّٰی کہ تاریخی ناول میں بھی عموماً حال کے چھپے ہوئے آثار موجود ہوتے ہیں۔ ناول ایک ایسی تہذیب کی دیو مالا ہے جو اپنی روزمرہ زندگی سے مسحور ہے۔ یہ اپنے عصر سے پیچھے ہے نہ آگے ،بل کہ اُس کا ہم دوش ہے۔ یہ مریضانہ ماضی پرستی یا غیر حقیقی اُمید کے بغیر اس کی جھلک ہے۔ ماضی پرستی اور تخیلاتی دُنیادونوں سے انکار کا مطلب ہے کہ حقیقت پسندناول سیاسی نقطۂ نظر میں رجعت پسند ہوتا ہے نہ انقلابی ۔ اُس کی بجائے یہ اپنی روح میں مثالی مصلح ہے۔ یہ حال کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے،لیکن ایک ایسے حال کے ساتھ جو ہمیشہ تبدیلی کے عمل سے گزرتا رہتا ہے یہ کسی اور دنیا کا مظہر ہونے کی بجائے اِس دنیا کا عمل ہے،لیکن چوں کہ تبدیلی، دُنیا داری کا ایک حصّہ ہے تو یہ پیچھے مڑ کے دیکھنے والا بھی نہیں ہے۔ناول اور

رزمیہ ماضی کی طرف اپنے رویّے کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن اِن دونوں میں ایک اور بنیادی فرق بھی ہے، رزمیہ طبقہء اشرافیہ اور جنگی ہیروز کی دُنیا سے تعلق رکھتا ہے ،جب کہ ناول روزمرّہ زندگی سے متعلق ہے ۔یہ بہت مقبول صنف ہے، ایک مرکزی ادبی طرز جو عام لوگوں کی زبان بولے۔ ناول عظیم بول چال والا ادبی فن ہے، جو کسی مخصوص ادبی زبان کی بجائے معمولی بول چال پر انحصار کرتا ہے۔ یہ پہلی ادبی ہیئت نہیں ہے کہ جس میں عام لوگ نمود ار ہوتے ہیں، لیکن انھیں غیر متزلزل سنجیدگی سے موضوع بنانے میں یہ اوّلین ہے۔'' ۳۹

مرزا رُسوا نے ''امراؤ جان ادا'' میں تہذیبی،فکری اور اُسلوبیاتی حوالے سے اپنے ہنر کا معقول اظہار کیا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ''آگ کا دریا'' اور ''اُداس نسلیں'' ایسے بہت بڑے تخلیقی تجربات سے غیر مطمئن مجنوں گورکھ پوری بھی یہ کہتے ہیں:

'' اُمراؤ جان ادا'' اُردو کا عظیم ترین ناول ہے۔'' ۴۰

بیسویں صدی عیسوی کا سورج طلوع ہوتے ہوتے'' اُمراؤ جان ادا''ایسا کثیر جہتی، رجحان ساز اور واقعیت پسند فن پارہ سامنے آچکا تھا،جس سے اُردو کتھن میں خوش گوار تبدیلیوں کی راہ ہموار ہونی چاہیے تھی،مگر اُنھی برسوں میں یورپی ادب کے زیرِ اثر جدید تعلیم سے بہرہ یاب بعض اُردو ادیبوں نے اُردو کتھن میں رومانوی افکار متعارف کروانے شروع کردیے،جس کی وجہ سے اُردو نثر اور کہانی کاری کو بہت نقصان پہنچا۔'پھر بھی' اُمراؤ جان ادا'' کے توسّط سے اُردو کہانی کاری میں تہذیبی مطالعے اور واقعیت پسندی کی جو راہ ہموار ہوئی تھی،اُس کے اثرات ،پریم چند اور ترقی پسند تحریک سے سعادت حسن منٹو اور غلام عباس تک اُردو کتھن کے کئی اہم مقامات پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

1. Asaduddin, M. First Urdu Novel, Contesting Claims and Disclaimers.î The Annual of Urdu Studies 16(1),2001.page:76-97

2. Yaqin, Amina, Truth, Fiction and Autobiography in the Modern Urdu Narrative Tradition.î Comparative Critical Studies 4(3)2007,Page379-402

3. Stanton,Kay , Shakespeare's 'Whores' Erotics, Politics, and Poetics,California State University, Fullerton, USA, Palgrave Macmillon,2014,Page 01

۴۔ کے۔کے۔کھلر ،اُردو ناول نگار خانہ،سیمانت پرکاشن،نئی دہلی،۱۹۸۳ء،صفحہ نمبر۳۱

۵۔ قاضی افضال حسین،متن کی تانیثی قرأت،دریافت،اسلام آباد،شمارہ ۱،جون ۲۰۰۲ء،صفحہ نمبر ۳۷۷۔۳۷۶

۶۔ مرزا محمّد ہادی رُسوا،امراؤ جان ادا،سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور،۱۹۹۶ء،صفحہ نمبر ۳۶

۷۔ ایضاً،صفحہ نمبر۴۹

۸۔ ایضاً،صفحہ نمبر۵۳۔۵۲

۹۔ ایضاً،صفحہ نمبر۷۶

۱۰۔ ایضاً،صفحہ نمبر۹۲

۱۱۔ ایضاً،صفحہ نمبر۹۳

۱۲۔ ایضاً،صفحہ نمبر۱۵۷

۱۳۔ ایضاً،صفحہ نمبر۷۷۔۷۶

۱۴۔ احسن فاروقی،سنگم،دی بک کارپوریشن ،کراچی،۱۹۶۱ء،صفحہ نمبر۲۲۴

۱۵۔ مرزا محمّد ہادی رُسوا،امراؤ جان ادا،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۵۸۔۵۷

۱۶۔ ایضاً،صفحہ نمبر۱۲۴۔۱۲۳

۱۷۔ ایضاً،صفحہ نمبر۲۱۔۲۰

۱۸۔ ایضاً،صفحہ نمبر۱۴۷

۱۹۔ احتشام حسین ،''لکھنو۔ادبی مرکز'' مشمولہ انتخاب؛ احتشام حسین، مرتبہ فقیر احمد فیصل،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر ۱۰۷

۲۰۔ مولانا صلاح الدین احمد، اُردو میں افسانوی ادب،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر ۲۱

۲۱۔ ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری مارہروی،''مرزا محمّد ہادی رُسوا ؛ سوانح حیات اور ادبی کا رنامے''،مجلسِ ترقیء ادب،لاہور، ۱۹۶۳ء،صفحہ نمبر۲۸۰

۲۲۔ ٹیری ایگلٹن ،''ناول کیا ہے''،(مترجم:صائمہ ارم)،مشمولہ تخلیقِ مکرّر ۲۰۰۶ء،جی۔سی۔یونی ورسٹی، لاہور،صفحہ نمبر۹۴

۲۳۔ آصف فرخی،،''اُردو ناول کی داستان''،سوغات،بنگلور،ستمبر ۱۹۹۳ء،صفحہ نمبر۱۳۵

۲۴۔ مرزا محمّد ہادی رُسوا،امراؤ جان ادا،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۱۷۲۔۱۷۱

۲۵۔ ایضاً،صفحہ نمبر۱۶۹

۲۶۔ ایضاً،صفحہ نمبر۱۶۹

۲۷۔ ایضاً،صفحہ نمبر۱۷۰۔۱۶۹

۲۸۔ ایضاً،صفحہ نمبر۱۸۷

۲۹۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی،'' ناول میں معنی خیزی''، سرسیدین ، پاکستانی ادب جلد ۵،فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راول پنڈی، صفحہ نمبر۷۹۹۔۷۹۸

۳۰۔ مرزا محمّد ہادی رُسوا،امراؤ جان ادا،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۱۹۵۔۱۹۴

۳۱۔ ایضاً،صفحہ نمبر۱۹۵

۳۲۔ ایضاً،صفحہ نمبر۲۰۰۔۱۹۹

۳۳۔ ایضاً،صفحہ نمبر۶۶۔۶۵

۳۴۔ ایضاً،صفحہ نمبر۸

۳۵۔ ایضاً،صفحہ نمبر۲۰۳

۳۶۔ ایضاً،صفحہ نمبر۵۰

۳۷۔ ایضاً،صفحہ نمبر۱۰۵

۳۸۔ مرزا محمد ہادی رسوا،بحوالہ'' داستان اور ناول؛تنقیدی مطالعہ''،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۱۰۵

۳۹۔ ٹیری ایگلٹن،''ناول کیا ہے''،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۹۲

۴۰۔ مجنوں گورکھ پوری،مشمولہ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' (عہدِ حاضر کے ۲۴ اہم ادیبوں انٹرویو)،مرتب طاہر مسعود،مکتبہ تخلیقِ ادب،کراچی ۱۹۸۵ء طبع ثانی،صفحہ نمبر ۷۶